Negotiations 2:1 (2022) pp. 75-81 **ISSN: 2789-293X**

رشید امجد کے افسانوں میں فردِ واحد کی شناخت کا بحران

Crisis of an Individual's identity in Rasheed Amjad's Fiction

Babar Hussain
Lecturer Urdu, Al-khair University AJK, Bhimber.
Beenish Fatima
Lecturer Urdu, Federal Urdu University of Arts, Science & Technology, Islamabad.

KEYWORDS

Frustration
Individual
Crisis
Dissemination
Class Differences

DATES

Received 05-01-2022
Accepted 03-02-2022
Published 20-03-2022

QR CODE

ABSTRACT

Rasheed Amjad holds a recognized place in the genre of Urdu fiction. He laid the foundation of bringing the old visions of mysticism in conformity of scientific innovation. The topics discussed by him are very much developed in thought. In this genre he has discussed many aspects in term of an individual and his or her problems. While exposing the internal and external aspects of a person on individual and social levels we see a crisis of a person's individual identity in Rasheed Amjad's short stories.

DOI:https://doi.org/10.54064/negotiations.v2i1.42

ڈاکٹر رشید امجد اردو افسانے میں منفرد مقام کے حامل افسانہ نگار ہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں انہوں نے نئے فکری، فنی اور اسلوبیاتی تجربے کیے، جنہوں نے نہ صرف ان کے ہم عصروں بلکہ بعد میں آنے والوں کو بھی بے حد متاثر کیا۔ رشید امجد کے افسانے سماجی سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ گہری فلسفیانہ معنویت رکھتے ہیں۔ انہوں نے تصوف کے قدیم تصور کو جدید سائنسی انکشافات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے جدید مابعد اطبیعاتی فلسفے کی بنیاد رکھی۔ جس نے جدید اردو افسانے کو فلسفیانہ درجہ عطا کیا ہے۔ یہ معنوی گہرائی ان کی کہانی میں بھی موجود ہے اور اسلوب میں بھی۔ کہانی بیان کرنے کا

مخصوص انداز اور اسلوب کی شگفتگی ان کی انفرادی پہچان ہے اور افسانے کے اگلے پڑاؤ کی نشاندہی بھی۔ رشید امجد کے موضوعات میں بہت تنوع ہے ۔انہوں نے زندگی اور فرد کے حوالے سے مختلف مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ باطنی اور مابعد اطبیعاتی مسائل کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں سماجی سیاسی پس منظر میں لکھے گئے ان کے افسانوں میں آج کے فرد کی مکمل سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ ان کے یہاں شناخت کا بحران فرد اور معاشرہ ہر دو سطح پر موجود ہے اور ان کا افسانہ آج کی مکمل معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں شاید ہی کسی کے یہاں موضوعات کی اتنی رنگارنگی موجود ہو۔

رشید امجد اردو افسانے کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ پاکستانی ادب کے ان بنیاد گزاروں میں سے ہیں جنہوں نے تخلیقی اور تنقیدی دونوں سطحوں پر پاکستانی ادب کے خدوخال اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد پاکستانی ادب کی تحریک قبل از وقت تھی جس کا مقصد ترقی پسند تحریک کی مخالفت کرنا تھا۔ چنانچہ یہ تحریک اپنے آغاز ہی میں انجام کو پہنچ گئی۔ لیکن ۶۵ء کی جنگ نے پہلی بار زمین کی محبت اور پاکستانیت کے احساس کو نئے معانی دیے اور پاکستانی ادب کا تصور ایک نئے انداز سے سامنے آیا۔ اس تصور کو حقیقی معنی دینے والوں میں رشید امجد کا نام سرفہرست ہے۔

"رشید امجد نے سیاسی و سماجی موضوعات فرد کی نفسیاتی کیفیات، فرد اور خاندان کے باہمی تعلق محبت کے نازک رشتے جذباتی تعلقات کی بازیافت جدید شہری زندگی کے فرد پر دباؤ اور اس کے نتیجے میں فرد کی اندرونی شکست وریخت ہمارے خارجی ماحول میں آنے والی تبدیلیوں اور فرد کے باطن میں موجود روحانیت یا اگر آپ اس سے گریز کرنا چاہتے ہیں تو ساری دنیا سے اوپر اٹھنے کی خواہش وغیرہ کو اپنے افسانوں میں بار بار ابھارا ہے"[1]

رشید امجد دور حاضر کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں سے ہیں اور بطور افسانہ نگار اپنی انفرادی شناخت مستحکم رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کے دیگر موضوعات کے علاوہ فردِ واحد کی شناخت کا بحران ایک اہم موضوع ہے۔ ناول، افسانہ، داستان یا کوئی قصہ کہانی مصنف زندگی سے متاثر ہو کر ہی لکھتا ہے۔ البتہ اس کا بیان کرنے کا انداز مختلف ہو سکتا ہے۔ زندگی اور افسانے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مصنف اپنے اردگرد کے ماحول سے جو کچھ اخذ کرتا ہیں اسے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ آغاز سے اب تک فرد کی شناخت کی متنوع صورتیں ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ ہر عہد، علاقے اور ہر افسانہ نگار کے ہاں اس کی ہیت ترکیبی اور خصوصیات میں فرق بھی ہے اور مماثلت بھی۔ اردو افسانے میں فرد واحد کا کردار خارجی حقیقتوں کے ساتھ باطنی صداقتوں کو پیش کرنے میں بہت نمایاں اور دیگر کرداروں کے مقابلے میں زیادہ مفید رہا ہے۔

"جدید افسانے میں فرد کی شناخت انسان کی شناخت کا ذریعہ بنا اور بڑا فعال اور مرکز نگاہ بن کر افسانے میں نمودار ہوتا ہے۔ اس حوالے سے رام لعل لکھتے ہیں "جب ہم جدید کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو متعلقہ مفاہیم کے ایک وسیع تصور کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہمارا ذہن فوری طور پر کچھ ایسی اشیاء سے بھی روشناس ہوتا ہے جو ختم ہو رہی ہیں یا تبدیل ہو رہی ہیں ان کے ساتھ ساتھ ہم ان تصورات یا ان مفاہیم یا ان اشیاء سے بھی روشناس ہوتے ہیں جو وجود میں آرہی ہیں اور قدیم کی جگہ پا رہی ہیں"[2]

---

[1] امجد طفیل، **"گمشدہ آواز کی دستک"** (لاہور: اوراق، 1997ء)، 479-481۔

[2] رام لعل، **اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا** (نئی دہلی: ساعت پرکاش، 1985ء)، 94۔

ہر فرد کی سماجی سیاسی حوالے سے ایک شناخت ہوتی ہے۔ بلکہ ملکی یعنی جغرافیائی حوالے سے بھی اس کی ایک شناخت ہے اس کے علاوہ ہر فرد اپنی تاریخ، مذہب اور خطے کے حوالے سے بھی اپنی پہچان رکھتا ہے لیکن جدید دور کے گوناگوں مسائل اور فلسفیانہ بحثوں خصوصاً ً وجودیت کے فلسفہ کے حوالے سے فرد اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ جدید دور میں طبقاتی حوالے سے بھی عام آدمی کی کوئی پہچان نہیں۔ اسی طرح سیاسی جبر کے دور میں بھی بے شناخت ہو جاتا ہے۔ پورے کائناتی تناظر میں بھی دیکھا جائے تو فرد کی حیثیت اس عظیم کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی نہیں رہتی۔ رشید امجد کے افسانوں میں شناخت کی ان تمام صورتوں پر بات کی گئی ہے۔ قدیم اور جدید دونوں طرح کے افسانوں میں کسی بھی اور افسانہ نگار کے یہاں یہ موضوع اس طرح نہیں آیا۔ ساٹھ کی دہائی میں لکھنے گئے چند افسانہ نگاروں سمیع آھوجا، منشایاد، اعجاز راہی وغیرہ کے ہاں اس موضوع پر چند ایک افسانے ہی ملتے ہیں۔ جبکہ رشید امجد کے یہاں یہ موضوع تواتر سے اور متنوع صورتوں میں موجود ہے۔ رشید امجد کا فنی سفر ہمیشہ ارتقاء پذیر نظر آتا ہے۔ انہوں نے دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ فرد واحد کی شناخت کو موضوع بحث بنایا ہے اور یہ وہ موضوع ہے جو شروع سے لے کر اب تک ارتقاء پذیر ہے اور اسی وجہ سے یہ اپنی الگ اور منفرد پہچان بنائے ہوئے ہے۔ جس میں ذہنی انتشار، طبقاتی و معاشی مسائل، معاشرتی ناانصافی اور حقوق کی پامالی کے حوالے سے قابل ذکر ہے۔ فرد خواہ معاشرے کے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو اس کی عزت آبرو غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں خواہ اس کی اپنی کوئی بھی شناخت نہ ہو

"بے زار آدم کے بیٹے" میں فرد فرسٹریشن کا شکار ہو کر غم و غصہ کی کیفیت تک پہنچ جاتا ہے اور یہی سے شناخت کا بحران شروع ہوتا ہے۔ فرد فطری طور پر اپنا رویہ منفی اختیار کرنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت اس کی خود کی پیدا کردہ نہیں بلکہ معاشرتی رویوں کا ردعمل ہوتا ہے۔ فرد کے لیے زندگی دہشت و خوف کا منبع بن جاتی ہے۔

"مجھے یاد آتا ہے اُنے کہا تھا کی اس گھر میں بھی گدھ رہتے ہیں۔ میں خاموشی سے دروازہ کھولتا ہوں۔ نم آلودہ بو مجھ سے لپٹ جاتی ہے۔ میں آہستگی سے اندر داخل ہوتا ہوں۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ کئی گدھ پروں میں سر دیئے اونگھ رہے ہیں۔ میرے اندر جاتے ہی وہ پروں سے اپنی چونچ باہر نکالتے ہیں۔ ان کی لمبی نکیلی چونچوں پر لہو جما ہوا ہے۔ جونہی میں کمرے کے وسط میں پہنچتا ہوں، وہ مجھ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور میرا گوشت نوچنے لگتے ہیں۔ میں زمین پر گر پڑتا ہوں۔ وہ شور مچاتے، پروں کو پھڑ پھڑاتے مجھے نوچنے میں مصروف رہتے ہیں۔ میں دونوں ہاتھوں سے انہیں پرے دھکیلنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میرے ہاتھ حرکت نہیں کرتے۔ رفتہ رفتہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگتی ہے"[3]

سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کی ٹوٹ پھوٹ نے فرد سے اُس کی اصل پہچان چھین لی ہے۔ فرد میں خوف، دہشت کے ساتھ ساتھ نارا ضگی، غم و غصہ اور توڑ پھوڑ کی کیفیت بھی جنم لیتی ہے اور فرد اپنے آپ سے خود کلام ہو جاتا ہے اور وہ خود "میں" اور "وہ" ہو جاتا ہے اور یہی خود کلامی رشید امجد کے ہاں فرد واحد کی ذہنی اور جسمانی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ فرد کی شناخت کا بحران رشید امجد کے فنی سفر میں ہمیں رواں دواں نظر آتا ہے اور فرد کی غیر متوازن شخصیت ہمارے سامنے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ رشید امجد کا افسانہ "بگل والا" ایک غیر معمولی افسانہ ہے۔ جس میں ایک بگل والے کو اپنے فن پر بڑا فخر ہے اور اپنے فن کے بارے میں وہ اپنی بیوی کو بڑے فخر کے ساتھ بتاتا ہے کہ ایک عام آدمی سپاہی سے لے کر بڑے سے بڑے آفیسر میری بگل کی آواز سن کر حرکت میں آجاتے ہیں کیونکہ میں ایک بگل والا ہوں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اس طرح کی باتیں سن کر بگل

---

[3] رشید امجد، **بے زار آدم کے بیٹے، گملے میں اُگا ہُوا شہر** (اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، 2015ء)، 48-49۔

والے کی بیوی اپنے آپ کو اعلیٰ درجے کی خواتین میں تصور کرنے لگتی ہے۔ ایک دفعہ ایک تقریب میں بگل والے کی بیوی جاتی ہے اور وہ پہلی نشست پر جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور دو افراد بڑے ہی نرم لہجے میں آ کر مخاطب ہوتے ہیں لیکن پتہ چلنے کے بعد اُسے وہ نشست چھوڑنے کو کہتے ہیں آخر کار کرتے کرتے وہ آخری نشست تک پہنچ جاتی ہیں۔

"بہت دیر ہو گئی اور وہ باہر نہ نکلی تو بگل بردار اسے تلاش کرتا اندر آ گیا۔ وہ اسی طرح چپ اپنی کرسی پر بیٹھی تھی جیسے کسی نے اسے اور کرسی کو ایک پتھر سے تراشا ہے۔ بھاگو ان، سب چلے گئے اور تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو۔۔۔۔ خیر تو ہے نا۔۔۔۔ اتنی تذلیل۔۔۔ اتنی تذلیل"[4]

رشید امجد اُن نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہیں جن کے یہاں فکر و فن کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ فلسفیانہ رویے اور موضوعات کی گہرائی و گیرائی کی وجہ سے ان کے افسانے معنوی اعتبار سے بڑے افسانوی ادب میں شمار ہوتے ہیں۔ جو افسانے کو موضوع فکر اور فنی حوالے سے دیگر اصناف سے بالکل علاحدہ صنف سمجھتے ہیں۔ یہ اردو افسانے میں ایک الگ ہیتی تشخص قائم کیے ہوئے ہیں۔ رشید امجد ان بنیاد گزاروں میں سے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ افسانہ اپنا ایک الگ وجود اور جہاں رکھتا ہے۔ موضوعات کے حوالے سے ان کے ہاں باطن اور خارج کے ان گنت اور کہے اَن کہے موضوعات موجود ہیں ان میں کچھ عصری مسائل اور کچھ سامنے کی باتیں ہیں۔ الجھے مسائل، نفسیاتی اور لاشعوری دنیا سے متعلق ہیں۔ یہ الجھاؤ ان کی فکر میں نہیں بل کہ مسائل کے گہرے ہونے میں ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کو پرکھ رہے ہیں۔ آج کا فرد بہت کشمکش اور الجھاؤ کا شکار ہے۔ جس میں خارجی جبر فرد کی شناخت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے

ہر فرد کی سماجی اور سیاسی حوالے سے ایک شناخت ہوتی ہے۔ بلکہ ملکی یعنی جغرافیائی حوالے سے بھی اس کی ایک شناخت ہے۔ اس کے علاوہ ہر فرد اپنی تاریخ، مذہب اور خطے کے حوالے سے بھی اپنی پہچان رکھتا ہے لیکن جدید دور کے گوناگوں مسائل اور فلسفیانہ بحثوں خصوصاً ً وجودیت کے فلسفہ کے حوالے سے فرد اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ جدید دور میں طبقاتی حوالے سے بھی عام آدمی کی کوئی پہچان نہیں۔ اسی طرح سیاسی جبر کے دور میں بھی بے شناخت ہو جاتا ہے۔ پورے کائناتی تناظر میں بھی دیکھا جائے تو فرد کی حیثیت اس عظیم کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی نہیں رہتی ۔ رشید امجد کے افسانوں میں شناخت کی ان تمام صورتوں پر بات کی گئی ہے۔ ان کے افسانہ "لیمپ پوسٹ" کا موضوع سسکتی زندگی، معاشرتی سلوٹیں ، طبقاتی تقسیم، انتشار اور ہمارے معاشرتی رویے اور گھٹن زدہ ماحول ہے۔

"اندھیرا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ گلی کے سرے پر لیمپ کی نحیف روشنی تاریکی کے دامن میں سسک رہی تھی اور چاروں طرف پھیلا ہوا سناٹا کروٹیں لے رہا تھا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ کھڑکی سے چھن چھن کر آتی نحیف کرنیں ہلا ہلا کر مجھے جگا رہی تھیں سانس کے تار درست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے گلی میں جھانکا، گلی کے سرے پر کھڑا میرا دوست میری راہ تک رہا تھا..... اندھیرے نے گلی کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ میں نل پر آیا اور چلو بنا کر یوں پانی پینے لگا، جیسے چشمہ سے جل بھر رہا ہوں ۔ ٹھنڈے پانی کے چند گھونٹوں نے ذہن سے چمٹی ہوئی سیاسی دھوڑ الی۔ میں نے دو چار چھینٹے منہ پر مارے اور گلی کے سرے پر آ گیا لیمپ پوسٹ سنسان رات رات میں تنہا، اداس کھڑا میری راہ تک رہا تھا"[5]

---

[4] ایضاً

[5] ایضاً، 23۔

اس طرح کی ذہنی گھٹن فرد کے اندر منفی رویوں کو جنم دیتی ہے اور معاشرے کے ساتھ فرد کا رویہ غیر مناسب رہتا ہے۔ فرد ہر وقت فرسٹریشن کا شکار رہتا ہے اور یہ فرسٹریشن فرد کی اپنی پیدا کردا نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے معاشرے کا عمل دخل ہے۔ فرسٹریشن انسان سے اُس کی خود کی پہچان تک چھین لیتی ہے یہاں تک کہ وہ معاشرے کے ساتھ بغاوت پر اُتر آتا ہے اور فرد خود بے شناخت ہو جاتا ہے۔ شناخت کا یہ مسئلہ فرد میں دو طرح سے سے عیاں ہوتا ہے ایک داخل اور دوسرا خارج کے حوالے سے یہاں تک کہ یہ مسئلہ فرد کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے اور اُسے کچھ یاد تک نہیں رہتا ہیں اور فرد کی یادداشت تک چلی جاتی ہے۔

"پھر محسوس ہوتا کہ اسے بھی قبر میں اتار دیا گیا ہے۔ قبر چھوٹی ہے لیکن دفن کرنے والے اسے زبردستی ٹھونک ٹھانک کر اس میں فٹ کر گئے ہیں.....وہ چونک کر بیوی کو دیکھتا اور پھر اس سے پوچھتا.....

"ہمارے دائیں طرف کون رہتا ہے؟"

وہ کہتی"..... آپا صدیقہ"

وہ کہتا"..... نہیں، اس کے خاوند کا نام بتاؤ؟"

وہ کہتی.....حاجی عبدالغفور"

وہ پوچھتا.....اور بائیں طرف"

وہ کہتی.....اچھن خان"

اور پھر پوچھتا.....اور پچھلی طرف"

وہ کہتی....."عبدالمجید"

"اور سامنے"

"عبدالمنان"

"اور اوپر"

وہ جھنجلا کر کہتی....."خدا"

لیکن وہ اس کی جھنجلاہٹ کو محسوس کیے بغیر اس سنجیدگی سے پوچھتا،"اور نیچے"

ایک دو منٹ تک اس کی بیوی کو کچھ نہ سوجھتا پھر وہ غصے سے کہتی....."قبرستان"[6]

تحفظ کی عدم دستیابی ہمارے ماحول ہی کی پیداوار ہے جس سے آج کا فرد فرسٹریشن کا شکار رہتا ہے۔ جو اس کو بہت سے ذہنی عارضوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر صفیہ عباد کہتی ہیں:

---

[6] ایضاً، 20-21۔

"رشید امجد کی کہانیاں کا "فرسٹریشن میں" اپنے ماحول سے دلبرداشتہ ضرور ہے لیکن خود کو مکمل طور پر منفی سوچ کی سپردگی میں نہیں دیتا۔ وہ ماحول کی ٹوٹ پھوٹ سے نئے ماحول اور نئی زندگی کا طلبگار ہے۔ لیکن یہ طلبگاری اس کے اندر فوری طور پر بیدار نہیں ہوتی۔ فوری ری ایکشن برہمی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ رشید امجد کے یہاں عدم تحفظ کا احساس اور اس کی ایک ابتدائی شکل ان کی ابتدائی کہانیوں میں واضح صورت نظر آتی ہے ۔ یہ صورتِ حال معاشرے میں متضاد اور منفی رویوں سے ہی جنم لیتی ہے۔ معاشرے کے اندر بداعتمادی کا عنصر پھلتا پھولتا نظر آتا ہے"[7]

فرد معاشرے کے خواہ کسی بھی طبقے سے وابستہ ہو اس کے جذبات و احساسات انمول ہوتے ہیں جس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ چاہیے فرد کی معاشرے میں کوئی بھی قدر و قیمت اور شناخت نہ ہو۔

"کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اور راحت کبوتروں کا جوڑا ہیں جو بدقسمتی سے گدھوں کے گھونسلے میں آن پھنسے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اس مکان میں راحت کا تصور نہ ہوتا تو میں کبھی کا یہاں سے بھاگ چکا ہوتا، چاہے مجھے بھوکوں ہی کیوں نہ مرنا پڑتا۔ چوہدری صاحب اور ان کی بیوی سے تو مجھے اسی حد تک دلچسپی ہے کہ ان کے گھر میں راحت کا تصور ہے ورنہ اپنے پھوپھا پھوپھی ہونے کی حیثیت سے میں کبھی ان کو اتنی اہمیت دینے کو تیار نہیں کہ وہ میرے حواس پر چھا جائیں۔ یہ درست ہے کہ میرے ماں باپ کی موت پر انہوں نے مجھے پالا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ میرے ذہنی زاویے ہی بدل ڈالیں"[8]

"دھند" کا موضوع جب خارجی جبر کے توسط سے ابھرتا ہے تو راستہ معدوم نظر آتا ہے۔ جس فرد نے دھند میں سفر شروع کیا تھا وہ سفر آج بھی دھند کی ہی نذر ہو رہا ہے۔ راستے دھند میں غائب ہو رہے ہیں۔ پہچان واضح نہیں ہے۔ ذہن، سوچ، خیالات، یقین کی عدم موجودگی، سب دھند کی لپیٹ میں ہیں۔ دھند کے یہ وہ غائب اور اجتماعی عناصر ہیں جو رفتہ رفتہ خارج سے داخل کی طرف محوِ سفر رہے۔ اس سے اذہان مفلوج ہوئے۔ اور ذہن کی داخلی اور خارجی دونوں سطحیں اس کی لپیٹ میں آ گئیں۔ افسانہ دھند اسی مجموعی کیفیت کا عکاس ہے۔ فرد آج بھی دھند کی اس کیفیت سے دست و گریبان ہے۔ دھند کا یہ موضوع فکری ارتقاء بھی ہے اور فکری گہرائی کا موجب بھی بن رہا ہے کیونکہ وقتی اور لمحاتی دھند اگر چھٹ بھی جائے تو اس کے باوجود اس کے اثرات معاشرتی ڈھانچے میں اندر ہی اندر کسی نہ کسی حوالے سے سرایت کرتے جاتے

"واقعات کی اہمیت کے ساتھ ساتھ کرداروں کی شخصیت اور انفرادی کشمکش کو موضوع بنانے کا ایک گہرا اثر اس دور کے افسانوں پر پڑا ہے۔ کرداروں کے ہر عمل کے پیچھے جو نفسیاتی محرکات کام کرتے ہیں ان کے مطالعہ کی اہمیت کا احساس بہت شدید ہو گیا ہے۔ افسانہ نگاروں نے خارجی عمل اور داخلی کشمکش اور اس کشمکش کی مختلف کیفیتوں کے پیچیدہ رشتے کو زندگی کی ایک ناگزیر حقیقت سمجھ کر اسے اپنے افسانوں کی بنیاد بنا لیا ہے"[9]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو رشید امجد کے افسانے فرد کی شناخت کی کئی پرتیں کھولتے ہیں۔ لیکن یہ شناخت یک رخی نہیں ہے کیوں کہ فرد معاشرے میں کئی طرح سے جی رہا ہے۔ ان کے افسانے فرد کو معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ رکھتے ہیں۔ رشید امجد اپنے عہد کے ایک منفرد افسانہ نگار

---

[7] صفیہ عباد، **رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ** (اسلام آباد: پورب اکادمی طبع اول، 2007ء)، 93۔

[8] رشید امجد، **لیمپ پوسٹ، گملے میں اگا ہوا شہر** (اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، 2015ء)، 11-12۔

[9] سید وقار عظیم، **داستان سے افسانے تک** (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 2008ء)، 142۔

ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں نئے نئے موضوعات کو متعارف کرایا ہے۔ جو ان کی کہانیوں کو دوام بخشتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنی ذہنی جولانی اور بوقلمونی کی بدولت ہی دنیائے افسانہ میں یکتا و یگانہ ہیں۔

☆☆☆